بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

نظرات

اسلامی تاریخ کے دورِ اوّل میں مسلمانوں کی دینی امامت اور سیاسی امارت کی مرکزی ہیئت ایک ہی ہوتی تھی، اور وہ اپنے دینی و سیاسی ہر دو امور میں اسی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ امیرالمومنین اور اس کے مقرر کئے ہوئے والی جہاں افواج کے سردار اور علاقوں کے منتظم ہوتے، وہاں وہ نمازوں میں امامت بھی کرتے اور جمعہ کی نمازوں میں خطبہ بھی دیتے۔ بے شک مرکزی ہیئت کے اس دوگانہ اقتدار کی بنیاد مسلمانوں کے باہم مشورے پر تھی، جس کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا تھا، اور رسول اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے اپنی زندگی میں اس پر عمل فرما کر صحابہ رضوان اللہ علیہم کے سامنے ایک زندہ مثال قائم کر دی تھی۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری سالوں میں اُمّت کی اس مرکزی ہیئت میں اختلال رونما ہوا، جس سے کہ پوری اسلامی سلطنت میں ایک عام انتشار پھیل گیا۔ اس کا ردّعمل یہ ہوا کہ بنواُمیہ اپنی فوجی طاقت کے بل پر برسرِ اقتدار آ گئے اور مسلمانوں کی دینی امامت جو خلفائے راشدین کے دور میں سیاسی امارت پر مقدم سمجھی جاتی تھی، اب آخر الذکر کے تابع ہو کر رہ گئی۔

بنواُمیہ کے سیاسی اقتدار کا سرچشمہ عرب تھے۔ جب تک وہ متحد رہے، بنواُمیہ کی حکومت قائم رہی۔ اور جب وہ آپس میں لڑ لڑ کر کمزور

ہو گئے، تو عباسیوں نے غیر عرب مسلمانوں کی مدد سے بنو اُمیہ سے اقتدار چھین لیا۔

عباسی سلطنت عربوں کے علاوہ غیر عرب مسلمانوں پر بھی مشتمل تھی۔ بلکہ وہ اس میں برابر کے شریک تھے۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، اس سلطنت میں غیر عرب مسلمانوں کی تعداد اور ان کے اثر و رسوخ میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ اب اس وسیع و عریض اور مختلف زبانیں بولنے والی اور مختلف نسلوں کی مسلمان قوموں پر مشتمل عبّاسی سلطنت کا نقطۂ ماسکہ اسلام تھا۔ اور اسی کی بدولت یہ ممکن ہو سکا تھا کہ بغداد کے زیر اثر اس عہد میں ایک عالمی سلطنت اور ایک عالمی تہذیب وجود میں آسکے، جس کا کہ دور دورہ کوئی پانچ سو سال تک رہا۔ اور جس کے آثار باقیات ہمیں اب تک مسلمانوں کے عقائد، دینی ادب، علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں ملتے ہیں۔

عباسیوں کی سیاسی امارت گو خلیفہ المتوکل کے بعد سے کمزور ہونی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن خلافت عباسی کے بانی المنصور نے اپنی سیاسی امارت کی بنیاد جس دینی امامت پر رکھی تھی، اس کی وجہ سے عباسی خلفاء اپنے سیاسی سربراہوں کے عملاً محکوم ہونے کے باوجود عقیدتاً اُمت کے دینی مرکزِ اطاعت مانے جاتے تھے اور اُنہیں مسلمانوں کے خلیفہ، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جانشین اور دین کے پیشوا سمجھا جاتا تھا۔ دراصل یہ عباسی خلیفہ تو محض ایک علامت اور SYMBOL ہوتے تھے، حقیقی دینی امامت اُن عقائد، افکار، روایات اور علوم کی تھی۔ جنہوں نے صدیوں کے ارتقاء کے بعد ایک منضبط شکل اختیار کر لی تھی۔ اس دینی امامت کے ترجمان و محافظ علماء ہوتے تھے، اور خلافت عباسی اس کی ایک عملی مظہر تھی۔

ان حالات میں جب دنیائے اسلام کے کسی حصے میں تاریخی، معاشی اور سیاسی محرکات کسی نئی طاقت کو بروئے کار لاتے۔ اور وہ اپنے مستقل وجود کو مؤثر

اڈعاں بنانے میں کوشاں ہوتی تو جہاں اس نئی طاقت کی پہلے کی سیاسی امارتوں سے ٹکر ہوتی، وہاں اس کے راستے میں وہ دینی امامت بھی حائل ہوتی، جو عباسی خلافت کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس دور اور اُن حالات میں سیاسی امارتوں کو اس دینی امامت سے تقویت ملتی تھی، اور دینی امامت اُن سیاسی امارتوں سے اثر و وقار حاصل کرتی تھی۔ چنانچہ ہر نئی سر اٹھانے والی طاقت کا ان دونوں سے تصادم ہوتا اور جتنی وہ طاقت زبردست ہوتی، اتنا ہی یہ تصادم سخت ہوتا تھا۔

مسلمانوں کے تمام تر نہیں، تو اکثر مذہبی فرقے یقیناً اسی تصادم کی پیداوار ہیں۔ اور اس لحاظ سے اگرچہ ان کی نوعیت مذہبی ہے، لیکن وہ نتیجہ ان تاریخی، معاشی و سیاسی محرکات کا ہی ہیں، جنہیں اس دور میں فطری طور پر بروئے کار آنے سے روکا گیا تھا۔

مثال کے طور پر مصر کی فاطمی خلافت اور اِدھر ایران میں ایرانیوں کی خود مختاری کی تحریکوں کو دیکھیے۔ فاطمیوں کو کافی عرصے تک جد و جہد کرنے کے بعد نہ صرف عباسیوں کے مقابلے میں مصر میں اپنی آزاد و مستقل خلافت قائم کرنی پڑی، بلکہ وہ اس پر بھی مجبور ہوئے کہ عباسی خلافت کے زیر اثر ایک خاص قسم کی جو دینی امامت بن گئی تھی اور جس سے کہ اس کے یا اس سے متعلقین کے سیاسی مفادات کو فائدہ پہنچتا تھا، اس کی بھی مخالفت کریں، اور اس کے مقابلے کے لئے اپنی مخصوص دینی امامت کو وجود میں لائیں اس طرح اسماعیلی تحریک صرف سیاسی اقتدار کے حصول کی جد و جہد نہ رہی، بلکہ وہ ایک دینی تحریک بھی بن گئی۔

کم و بیش یہی کچھ ایران میں ہوا۔ غرض اسماعیلی اور اثناعشری کی طرح اباضی یعنی خارجی اور اسی طرح کے اور بےشمار مسلمان فرقے اِنہیں تاریخی و سیاسی عوامل کی پیداوار ہیں، اور آج ان سب کا اسی تاریخی و سیاسی پس منظر میں مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی سے بعض مسلمان ملکوں کے علمی ادارے اس کی طرف اب متوجہ ہیں اور وہ اسلامی تاریخ کے ماضی کی اِس کثرت میں اُس

کے مستقبل کی وحدت کے لئے کوشاں ہیں۔

خود اس برصغیر میں جب انگریز ایک نیا ذہن، ایک نئی تہذیب اور ایک نیا سیاسی و معاشی نظام لے کر آئے، اور انہوں نے یہاں ایک ایسے نظم و نسق کو نافذ کیا، جو بتدریج انفرادی و قومی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہونے والا تھا، اور اس کو تسلیم کرنے سے کسی فرد، جماعت یا گروہ کو مفر نہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی و فکری آزادی کے دروازے بھی چوپٹ کھول دیئے گئے اور عیسائیوں، آریاؤں اور دوسرے غیر مسلموں نے اسلام پر علی الاعلان جرح و تنقید شروع کر دی، تو یہ حالات اس امر کے مقتضی ہوئے کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مسلمان کچھ کریں اور اپنے مذہبی، فکری اور اجتماعی وجود کو اس زبردست سیلاب میں غرقاب ہونے سے روکیں۔ جب ہمارے جمہور علماء اس طرف متوجہ نہ ہوئے اور انہوں نے اپنے سامنے شب و روز ہونے والے واقعات سے آنکھیں بند کر لیں۔ تو ملی تحفظ کے تقاضوں نے مختلف مذہبی فرقوں اور روشن خیال گروہوں کو جنم دیا۔ اور ان سے جو کچھ بُرا بھلا ہو سکا، انھوں نے یورپ کے نقصان دہ اثرات سے مسلمانوں کو کسی نہ کسی حد تک محفوظ رکھنے کی کوششیں کیں اور انہی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان انگریزی دور کے سیاسی و ذہنی غلبے سے بالکل ماؤف نہیں ہوئے، اور ان میں سیاسی شعور باقی رہا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگرچہ گزشتہ کئی صدیوں میں مسلمانوں کی غالب اکثریت بدلتے ہوئے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے محرکات سے بالعموم غفلت برتتی رہی اور اس نے عافیت اسی میں دیکھی کہ وہ ان چیزوں کو سرے سے قابل توجہ ہی نہ سمجھے، لیکن ان میں سے کچھ لوگ گو وہ اقلیت میں تھے، ان حالات و محرکات سے ضرور متاثر ہوتے رہے۔ جس کا کہ ردّ عمل ان تمام صدیوں میں مختلف مذہبی فرقوں کے ظہورِ وجود کی صورت میں ہوتا رہا۔ ان مذہبی فرقوں کو آپ ایک لحاظ سے

فکری و سیاسی تحریکیں سمجھ لیجئے، جو جمہور مسلمانوں کے ہمہ گیر جمود کو حرکت میں بدلنے میں ساعی تھیں، اور ان کی وجہ سے ہی جمہور مسلمانوں میں ایک حد تک زندگی کے آثار برابر موجود رہے۔

اس ضمن میں ایک قابل ذکر اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ جہاں مسلمان جمہور شروع میں ہر نئے فرقے کی سخت مخالفت کرتے تھے، وہاں آگے چل کر اگر اس فرقے کی کچھ باتیں اُس کے مجموعی مزاج کے لئے قابل قبول ہوتیں، تو وہ انہیں اپنا بھی لیتے تھے۔ اس کی وجہ سے باوجود کامل جمود کے، مسلمان جمہور کا فکری ارتقاء گو بہت کم ہی سہی۔ بہرحال کچھ نہ کچھ جاری رہا۔

ہماری تاریخ میں بارہا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک صدی کا زندیق و ملحد بعد کی صدیوں میں مجدد اور مصلح مانا گیا۔

سنت جاری، حالات و کوائف کے تحت اسلام کے تفصیلی احکام کی نئی تدوین، بنک کاری کا منافع، خاندانی منصوبہ بندی، حدود اور زکوٰۃ اور اس طرح کے نئے مسائل، جو آج ہمارے زیر بحث آرہے ہیں، ہمیں اس وقت جن نئے حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، یہ ان کے لازمی تقاضے ہیں اور جیساکہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ ملت اسلامی اپنی تاریخ کے اس تمام طویل عہد میں نئے حالات اور اس کے محرکات نو کا ردّ عمل برابر قبول کرتی رہی اور اسی کے نتیجے میں اس کے ہاں نئے رجحانات اور نئے افکار ابھرے، اسی طرح اب بھی ہوگا اور ہو کر رہے گا۔

اسلام ایک حرکی اور فعال پیغام کا حامل ہے۔ وہ زندگی کے حقائق سے آنکھیں موند لینے کا روادار نہیں۔ اگر ہم اسلام کی حرکت آفریں تعلیمات سے بالکل تہی دامن نہیں ہوگئے، تو نئے زمانے کے ٹھوس حقائق سے ہمیں عہدہ برآ ہونا اور اُن کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر معین کرنا ہوگا۔ اس میں غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ جن کی آگے چل کر اصلاح ہوسکتی ہے، لیکن یہ کہ کوئی اس خوش فہمی میں مبتلا ہوجائے کہ ان مسائل سے ہمیں الجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟

جیسے ہمارے بزرگ تھے، اسی طرح ہم بھی راہِ اسلاف پر گامزن رہیں اور ان کی طرح مکمل اطمینان سے زندگی گزاریں تو یہ خودکشی ہوگی۔

پہلے زمانوں میں اس قسم کے جمود کا ردِ عمل مذہبی فرقوں کے ظہور کی شکل میں ہوتا تھا، لیکن اب یہ ردِّعمل اور صورت اختیار کرے گا، جو اتنی سنگین ہے کہ اسے زبان پر لاتے ڈر لگتا ہے۔

یہاں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا ایک واقعہ عرض کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ وہ فرمانے لگے کہ تمہیں معلوم ہے مجھے مدرسہ دیوبند سے کتنی محبّت ہے اور میں اس کے بزرگوں کا کس طرح دن رات ذکر کرتا ہوں۔ اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں ایک بہت بڑی تبدیلی آرہی ہے، جس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر پڑیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مدرسہ دیوبند میں مناسب تبدیلیاں نہ کی گئیں، تو اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اب جو میں مدرسہ کی بہتری کے لئے کچھ کہتا ہوں، تو اس کے اربابِ اختیار سمجھتے ہیں کہ میں اس مدرسے کا مخالف ہوں۔ اور اس کی تباہی مجھے منظور ہے۔

اتنا فرمانے کے بعد وہ کہنے لگے کہ تم جو اپنی تاریخ میں اکثر زندیقوں اور ملحدوں کے حالات پڑھتے ہو، تو ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو دراصل آنے والے خطرات کے پیشِ نظر اپنے معاشرے میں ضروری اصلاح کے داعی تھے۔ لیکن لوگوں نے اُس زمانے میں انہیں زندیق اور ملحد قرار دیا۔ تم آج ان پر زندقہ اور الحاد کا حکم لگاتے وقت اس چیز کو ضرور ذہن میں رکھنا۔